تحریر

مجلہ زبان وادب

جلد ۰۲ شمارہ ۰۱، ۲۰۲۴

The Tragedy of Migration in Syed Asad Gilani's Fiction

سید اسعد گیلانی کے افسانوں میں ہجرت کا المیہ

Sidra Niamat
Lecturer, Aspire College, Pattoki
Correspondence: mahadch476@gmail.com

سدرہ نیامت

لیکچرار، اسپائر کالج، پتوکی

Abstract

The tragedy of migration in the stories of Syed Asad Gilani is a significant theme where the author portrays the events during and after the partition of India against the backdrop of human emotions and social changes. His stories reflect the experiences of migration, the sorrows, hardships, and the struggle for a new life. Gilani's narrative also highlights glimpses of history and culture, acquainting the reader with the emotional and societal issues of that era. Research on this topic helps understand Gilani's literary contributions and the importance of his stories in the context of migration.

Keywords: Migration Tragedy, Partition of India, Human Emotions, Social Changes, Syed Asad Gilani

Copyright: © 2023 by the authors.

This is an open-access article distributed under the terms and conditions of the Creative Common Attribution (CC BY) license

سید اسعد گیلانی ایک مقصدی ادیب ہیں۔ وہ اپنے افسانے میں مقصد کی ترویج و اشاعت کو اہمیت دیتے ہیں۔ ان کے لکھے گئے افسانے شر کے مقابلے میں خیر کی ترویج کرتے نظر آتے ہیں۔ ان کی فکر میں رجائیت پسندی اور اسلوب میں انشائی انداز افسانے میں رنگ بھرتا نظر آتا ہے۔ سید اسعد گیلانی کی افسانہ نویسی کے بارے میں ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی لکھتے ہیں:

تحریر
مجلہ زبان وادب
جلد ۰۲ شمارہ ۰۱، ۲۰۲۴

"سید اسعد گیلانی نے افسانہ نویسی کا آغاز ۱۹۳۹ء سے کیا جب تحریکِ آزادی کی لہر اور ترقی پسندی کی آندھی زوروں پر تھی۔ کسی نئے لکھنے والے کے لیے خود کو ترقی پسندی کے اُڑتے ہوئے گرد و غبار سے بچانا آسان نہ تھا کیونکہ اس دور میں اُردو افسانے پر ترقی پسندی کا غلبہ تھا۔ لیکن سید اسعد گیلانی نے اس رو میں بہنے کی بجائے اس کے رد میں چلنے کا شعوری قدم اٹھایا۔ ان کی افسانہ نویسی ایک مقصدیت سے پُر اور انفرادیت میں نمایاں ہے۔"(۱)

ان کے افسانوی ادب میں روز مرہ زندگی کے احساسات کو اجاگر کرنے کا پہلو نمایاں ہے۔ اسعد گیلانی کے ابتدائی افسانے اس دور کے معروف ادبی پرچوں "ادبی دنیا"، "ادب لطیف" اور "ساقی" میں شائع ہوتے رہے۔

پروفیسر فروغ احمد کی رائے میں:

"سید اسعد گیلانی کا افسانوی سرمایہ جو کہ زندگی کے محرکات پر محیط ہے، اپنے اندر وہ تمام خصوصیات رکھتا ہے جو جدید دور کے افسانے کو مطلوب تھیں۔ ان کے افسانوں میں مقصدیت افسانے کی نرم و نازک حدود اور ہیئت کا احترام کرتی نظر آتی ہے۔ اسعد گیلانی کے افسانے قاری کے ذہن پر ایک ایسا نقش چھوڑتے ہیں کہ وہ ان کے مشاہدہ، انشا اور رجائیت کے امتزاج میں کھو کر رہ جاتا ہے۔ وہ معمولی واقعات و حوادث کو اپنے فن کے تخیل (Art of thinking) سے نہایت باریک تفصیلی نقوش کا حامل بنا دیتا ہے۔"(۲)

سید اسعد گیلانی کے نزدیک افسانہ، افسانہ نگار کے قلب و ذہن میں چلنے والی تخیلاتی رو کا ایک خارجی پرتو ہوتا ہے جس کا اظہار اس کے جملہ افسانوی ادب میں ہوتا ہے۔ اسعد گیلانی افسانے کے بارے میں لکھتے ہیں:

"افسانہ انسانی زندگی کا پرتو ہوتا ہے جس میں افسانہ نویس اپنے تخیل کی آمیزش ضرور کرتا ہے اور وہ آمیزش ہی ہے جو ایک روکھی پھیکی روز مرہ کی بات کو قابلِ مطالعہ اور دلچسپ بنا دیتی ہے۔ افسانہ نویس رواں دواں زندگی کے تارِ احساس کو شدت سے ضرب لگاتا ہے اور اپنے تخیل کی پرواز شامل کرکے افسانہ کی صورت میں ایک نغمہ تیار کر دیتا ہے۔ کوئی یہ چاہے

تحریر
مجلہ زبان و ادب
جلد ۰۲ شمارہ ۰۱، ۲۰۲۴

کہ اس افسانے کا تجزیہ کر کے اس میں سے اصل محرک کو کھود نکالے تو یہ ممکن نہیں ہوتا۔"(۳)

سید اسعد گیلانی کی افسانہ نگاری چار افسانوی مجموعوں پر مشتمل ہے جن میں پہلا افسانوی مجموعہ "تصویریں" ۱۹۵۶ء میں، دوسرا مجموعہ "تھکی ہوئی روحیں" ۱۹۶۰ء میں، تیسرا مجموعہ "حکایاتِ جنوں" ۱۹۶۲ء میں اور چوتھا مجموعہ "لہروں کے نیچے" ۱۹۶۷ء میں شائع ہوا۔ ان کے دو افسانوی مجموعے "عدالت کا انتظار" ۱۹۷۵ء اور "ٹوٹی ہوئی اینٹیں" ۱۹۸۸ء میں انتخاب کے طور پر شائع ہوئے۔

ان افسانوں میں افسانوی مجموعہ "تصویریں" کا افسانہ "کمیں" دیہات کے پس منظر کا عکاس ہے۔ افسانوی مجموعہ "حکایاتِ جنوں" کا افسانہ "مجسمہ اور پرندہ" مملکتِ خداداد میں خدائی احکامات سے انحراف کی کہانی کا بیان ہے۔ افسانوی مجموعہ "لہروں کے نیچے" کا افسانہ "لہروں کے نیچے" اشتراکی سرخ جنت کے جہنم زاروں کی کہانی ہے۔ "تھکی ہوئی روحیں" کا افسانہ "مینا چھپی کا مندر" تاریک جابرانہ نظام کا ایسا خاکہ کھینچتا ہے جو اس نظام کے نقشوں کو واضح کر دیتا ہے اور اس نتیجے پر پہنچا دیتا ہے کہ یہاں انسان نہیں بلکہ پتھر اشرف المخلوقات ہے۔ افسانہ "تھکی ہوئی روحیں" اندیشہ ہائے دور و دراز سے بھرپور ہے جس کا ہیرو کئی طرح کے کربناک مراحل گزر کر شکستہ آرزوں کے ڈھیر میں انسانیت کی تلاش کرتا نظر آتا ہے اور "عدالت کا انتظار" ہجرت کی دکھ بھری کہانی ہے۔ افسانہ "کارزارِ حیات" دیہات کے سارے اونچ نیچ دکھاتا ہوا آگے بڑھتا ہے۔ ناول کا پیرو نادر دیہات کے ہر رگ اور ہر ادا پر کڑھتا اور اپنے دامن کو ہر طرح کی آلودگی سے صاف بچا کر نکل جاتا ہے۔ ان کے علاوہ کئی اور افسانے بھی اب تک اپنی تازگی برقرار رکھے ہوئے ہیں۔

سید اسعد گیلانی کے افسانوں میں موضوعات کا تنوع پایا جاتا ہے۔ ان افسانوں میں جہاں رومانس (Romance) ملتا ہے، وہاں ہجرت کی دکھ بھری کہانیاں بھی ہیں۔ پاکستان کے اندرونی حالات پر افسانے ملتے ہیں تو کچھ افسانے عالمی حالات و واقعات کا اظہار بھی لیے ہوئے ہیں۔ تقسیم ہند سے قبل عمومی افسانہ رومانیت کے ارد گرد گھومتا رہا۔ اس دور کے لکھے گئے سید اسعد گیلانی کے افسانے بھی رومانیت سے بھرپور ہیں جن میں تخیل کی بلندی اور جذبات کی فراوانی نظر آتی ہے۔ ان کے رومانی روایت کے حامل افسانوں میں افسانوی مجموعہ "تھکی ہوئی روحیں" کے افسانے "کورٹ شپ"، "فریبِ نفس" اور "مخالف سمتیں" ہیں۔

تحریر

مجلہ زبان وادب

جلد ۰۲ شمارہ ۰۱، ۲۰۲۴

تقسیم ہند:

افسانہ "عدالت کا انتظار" ایک ایسی عورت کی دلسوز کہانی ہے جسے حالات نے کہیں کا نہ چھوڑا اور اس کا گھر ہجرت کے بعد لٹ گیا۔ اس افسانے کا مرکزی کردار ساجدہ ہے جو اپنے ننھے بیٹے اختر کے ساتھ پاکستان پہنچ کر یہاں بھیک مانگنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ اس کی کہانی کچھ یوں ہے کہ تقسیم ہند سے قبل وہ ہندوستان کے صوبہ بہار کے شہر پٹنہ کے ایک معزز گھرانے کی فرد تھی۔ ان کے والد سجاد علی پٹنہ ہائی سکول کے ہیڈ ماسٹر تھے اور گاؤں میں باغات بھی تھے۔ اس نے اپنے دور کے عزیزوں کے ایک یتیم لڑکے رجب علی کو اپنے ساتھ رکھا، اسے تعلیم دلوائی اور ملازمت دلوانے کے بعد اس کی شادی ساجدہ سے کر دی۔ یوں وہ سسرال نہیں گئی بلکہ سسرال یہاں آئی۔

خوشیوں بھرے اس ماحول میں تقسیم کا غل غپاڑہ چل پڑا۔ اس کا میاں تبدیل ہو کر پاکستان چلا گیا اور اپنی ماں کو بھی ساتھ لے گیا۔ وہ اپنے بھائی کی پڑھائی کی وجہ سے ان کے ساتھ نہ جا سکی۔ خدا کی کرنی ایسی ہوئی کہ ان کے ابا بیمار ہو کر فوت ہو گئے۔ بھائی کے بڑے ہونے پر ان کی شادی کی خوشیاں دیکھنے کے بعد وہ گھر پر بوجھ محسوس ہونے لگی۔ یوں چاروں ناچار اسے پاکستان جانے پر تیار ہونا پڑا اور سفری صعوبتوں کے بعد وہ پوچھ پاچھ کرتے بچے کے ساتھ کراچی جا پہنچی۔ یہاں ہر آنے جانے والے کو وہ امید بھری نظروں سے دیکھتی کہ شاید اس کا میاں ہو یا ان کا بھیجا ہوا آدمی۔ اس نے مجبور ہو کر رکشہ کیا کیونکہ اس کے پاس ان کے دفتر اور گھر کا پتہ تھا۔ بابو رجب علی رضوی، کوارٹر نمبر ۸۴۰، مارٹن کوارٹرز، کراچی نمبر ۵۔ رکشہ کافی دیر اور کافی دور چلتا رہا۔ وہ جس جگہ جا کر رکا، سامنے کوارٹر پر نمبر ۸۴۰ لکھا تھا۔ دروازہ جو نیم وا تھا، اس پر لکھا تھا بابو رجب علی رضوی، بی۔ اے۔ اپنے گھر کا احساس اس کے دل میں کیا جذبات پیدا کرتا ہے۔ افسانہ نگار اس طرح بیان کرتا ہے:

> "میرا جی چاہا میں لپک کر اندر داخل ہو جاؤں۔ میرا دل چاہا میں اس تختی کو، اس نام کو، اس دروازے کو چوم لوں۔ میرا دل چاہا اس چوکھٹ کو چوم لوں۔ میں جہنم سے نکل کر جنت کے دروازے پر آ گئی تھی۔ سارا خوف، ساری دہشت، سارا غم اور ساری آفات پیچھے چھوٹ گئی تھیں۔ میں خوشی کے ساتھ چل رہی تھی۔ یہاں آ کر کچھ اور عجیب بات ہوئی۔ معلوم ہوا کہ اس دروازے پر لکھا نام تو بابو رجب علی رضوی کا نہیں ہے بلکہ کوئی اور ہی یہاں رہ رہا ہے۔

تحریر
مجلہ زبان وادب
جلد ۰۲ شمارہ ۰۱، ۲۰۲۴

جیسے پتھر، دھوکہ دے رہا ہے۔ جیسے چہرہ، چپٹے سے مسکراہٹ کے تحت سراغ کی تلاش کر رہا ہو۔ یہاں کوئی اور رہ رہا تھا۔ حالانکہ حقیقت میں یہ دروازہ بابو رجب علی رضوی کا تھا، لیکن اسے ایک بے چارے اور بالکل بھیڑ بکریوں کے جھرمٹ میں لاشوں کی طرح پڑا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ یہاں کچھ اور ہی ہو رہا تھا۔"(۴)

اس نے دروازے کا پٹ کھول کر دیکھا تو رجب علی ایک نوجوان عورت کے ساتھ بیٹھے ہوئے نظر آئے۔ اختر اور وہ اندر آئے تو ان کی آمد پر کوئی خوش نہ ہوا، نہ میاں اور نہ ساس۔ اب ساری حقیقت اس پر واضح ہو چکی تھی۔ ساجدہ کی زبانی افسانے کا نقطہ انجام قابلِ دید ہے:

"میں آسمان سے گری تھی لیکن زمین پر ٹک نہ سکی تھی۔ ہواؤں کا دوش مجھے سہارا دینے کے لیے تیار نہ تھا۔ زمین کا سینہ میرے لیے تنگ تھا۔ آسمان کی آغوش میں میں سما نہ سکتی تھی۔ اب کہیں کی نہ تھی۔ ہندوستان میں میرا گھر چھن گیا تھا اور پاکستان میں میرا گھر لٹ گیا تھا۔ اب میں کسی کی کچھ نہ لگتی تھی۔ دو مہینے سوکن، میاں اور ساس کی منتوں، خوشامدوں اور خدمتیں کرنے کے باوجود، وہ مجھے خادمہ بنا کر بھی نہ رکھ سکے۔ بالآخر کل شام دھکے دے کر گھر سے نکال دیا۔ بھائی کو پکارتی ہوں تو وہ بھابھی کے کان سے سنتا ہے۔ میاں کو پکارتی ہوں تو وہ بدل گیا ہے۔ آسمان اونچا، زمین سخت ہے، میں کہاں جاؤں، میری فریاد کون سنے، وہ عدالت لگائے گا تو وہی سنے گا۔ بس اس کی عدالت لگنے کا انتظار ہے۔"(۵)

یہ افسانہ جہاں ہجرت کی دکھ بھری کہانی کا بیان ہے، وہاں عورت کی وفاشعاری کا اظہار بھی اپنے اندر لیے ہوئے ہے۔ ساجدہ، جو افسانے کا مرکزی کردار ہے، ہندوستان میں اپنے چھوٹے بھائی کے لیے طرح طرح کی پریشانیاں جھیلتی ہے اور ہجرت کرتے ہوئے اپنے میاں کے لیے کئی مصائب و مشکلات برداشت کرتی ہے۔ پاکستان پہنچ کر اسے میاں بطور خادمہ بھی رکھنے کو تیار نہیں۔

افسانہ نگار سید اسعد گیلانی انسانی نفسیات کا خوب مطالعہ رکھتے ہیں اور اس کا اظہار بھی خوب کرتے ہیں۔ ان کا افسانہ

تحریر
مجلہ زبان وادب
جلد ۰۲ شمارہ ۰۱، ۲۰۲۴

"ٹوٹی ہوئی اینٹیں" ایک ایسے خاندان کی کہانی ہے جو ہجرت کر کے آیا مگر نہ ان کے لیے رہائش ہے اور نہ کھانے کو کچھ۔ اس خاندان میں والدہ کے ساتھ ان کی بچی حیات بیگم اور بیٹا قادر مال گاڑی کے خالی ڈبے میں رہائش رکھتے ہیں۔ بچے دن کو اور ماں رات کو بھیک مانگتی ہے۔

یہ ایک مکالماتی افسانہ ہے جو محمود اور حیات بیگم کے درمیان مکالمہ ہے۔ محمود ریل میں ملازم ہے اور حیات بیگم سات سالہ ایک شوخ و شنگ بچی ہے، جو بھیک مانگتے مانگتے محمود کے کمرے تک پہنچ جاتی ہے۔ حیات بیگم کی زبانی ان کی ہجرت کے حالات سن کر محمود، جو افسانے کا مرکزی کردار ہے، ایک گہری سوچ میں پڑ جاتا ہے۔ اس کے خاندان کا سربراہ انسان ہونے کے باوجود اختلافِ قومیت کے الزام میں خاک و خون کے طوفان میں کھو گیا تھا۔ اس کے خون سے تعمیر ہونے والے قصرِ ملت میں اس کی اولاد پر کیا گزری؟ افسانہ نگار اس طرح بیان کرتا ہے:

> "زندگی کی یہ ننھی سی بیٹی کسی کو ٹھے سکے کی طرح اپنے باپ کے خون سے بنائی ہوئی سرزمین میں بے رحم انسانوں کے ہاتھوں کی طرف تکتی ہوئی بھٹکتی پھر رہی تھی۔ وہ اس ملک کے شرفاء کے دروازوں پر بھٹکتی پھرتی رہی لیکن ان شرفاء کو اتنی فرصت کہاں تھی کہ کچھ وقت نکال کر قصرِ ملت کی اس ٹوٹی ہوئی اینٹ کی طرف بھی توجہ کرتے۔"(۶)

قصرِ ملت پر قابض فرعونوں پر طنز افسانے کا ایک اہم عنصر ہے، جس کا اظہار ان الفاظ میں ملتا ہے:

> "محمود کے پوچھنے پر کہ کہاں رہتے ہو؟ حیات بیگم نے کہا اسٹیشن پر مال گاڑی کے خالی ڈبے میں۔ تو اس نے کہا کہ ٹھیک ہے، اس سے بہتر اور مناسب جگہ اور کون سی ہو سکتی ہے۔ محمود نے سوچا تمہارے حصے کی زمین پر فرعونوں نے قصرِ اقتدار تعمیر کر لیا ہے اور تمہارے مکانوں کے کھنڈرات اور باپ بھائیوں کی ہڈیوں پر ہوس پرستوں نے اپنی بڑائی کے تخت بچھا لیے ہیں۔ یہ کیا کم ہے کہ انھوں نے تم کو مال گاڑیوں کے خالی ڈبوں میں رہنے کی اجازت تو دے رکھی۔"(۷)

درج بالا جملے طنز کے گہرے نشتر لیے ہوئے ہیں۔ افسانے کا ماحول نیچرل ہے، جس کا آغاز اس جملے سے ہوتا ہے:

تحریر
مجلہ زبان و ادب
جلد ۰۲ شمارہ ۰۱، ۲۰۲۴

"باؤجی، ون پائس، ون آنہ بھوکی ہوں باؤجی، روٹ دے دو۔"

کتنا فطری ہے جو قاری کے ذہن کو ہلا کر رکھ دیتا ہے اور افسانہ نگار کس طرح قصرِ اقتدار پر قابض فرعونوں سے قصرِ ملت کی ہر ٹوٹی ہوئی اینٹ کا جواب مانگتا ہے۔

افسانہ "کیڑے مکوڑے" قیام پاکستان کی تحریک کی کہانی ہے جو اپنے اندر دکھ درد بھی سمیٹے ہوئے ہے۔ جب پاکستان بننے کا اعلان ہو جاتا ہے اور لیڈر عوام کو پیچھے چھوڑ کر چلے آتے ہیں، عوام بغیر قیادت کے کوسوں پیچھے سر گرداں ماری ماری پھر رہی ہوتی ہے۔ وہ قیادت جن کے بغیر پاکستان کے جشنِ آزادی کا منانا ممکن نہ تھا، اپنی ساری دولت، جانور، صوفے، بسترے، کاٹھ کباڑ اور یہاں تک کہ کتے بھی ٹرکوں میں بھر لے گئے اور خود ہوا کے دوش پر اُڑے جا چکے تھے۔ افسانہ نگار نے عوام اور خواص کا فرق یوں واضح کیا:

> "عوام کیڑے مکوڑوں کی طرح اِدھر اُدھر رینگ رہے تھے یا سڑکوں کے دونوں طرف کیمپ لگائے پڑے تھے جیسے برسات میں بلوں سے لا تعداد ان گنت چیونٹے نکل آئے ہوں۔ ان چیونٹوں کے لیے کب کوئی اپنی محبوب کرسیاں، عزیز میزیں، پیارے کتے اور سوسائٹی کی دلربا اور پرانی دوست خواتین کو چھوڑ یا کرتا ہے۔ تاریخ کی شاہراہ پر لیڈر مارچ کرتے ہوئے گزرتے رہتے ہیں اور یہ انسانی کیڑے پاؤں کے نیچے چرمراتے رہتے ہیں۔"(۹)

کہانی کا مرکزی کردار ا ایک نواب ہے جو فخرِ ملت بھی ہے۔ جس کے کرتوت اس کی جاگیر کے مزارعین خوب جانتے تھے اور فکر مند تھے کہ پاکستان بننے کے بعد وہ اپنی ایسی ویسی حرکتوں سے باز آ جائے گا یا نہیں۔ اس کے منشی ماتے اس کے کاشتکاروں کو تنگ کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑتے۔ ایک خدا بخش کی ساری فصل اس لیے اٹھائی کہ اس نے نواب کے باغات میں کھدنے والی نہر کی کھدائی میں حاضری نہ دی۔ رحیم داد کو تمیز سکھانے کے لیے نواب کے سامنے گن کر چالیس جوتے لگائے گئے کہ اس نے نواب کے کارندوں کے سامنے اکڑنے کی کوشش کی اور کہا کہ نواب کوئی خدا تو نہیں۔ قادر خان کو بیگار میں پکڑ کر دن

تحریر
مجلہ زبان و ادب
جلد ۰۲ شمارہ ۰۱، ۲۰۲۴

پھر اس سے بگھی کی صفائی اور گھوڑوں کی مالش کرائی گئی کہ اس نے اپنی لڑکی سمعیہ کو نواب کے ہاں کام کے لیے نہ بھیجا حالانکہ نواب سمعیہ کے انتظار میں بیٹھا رہا۔ افسانہ نگار نے کمالِ فن سے نواب صاحب کی فطرت اور قادر خاں کی غیرت یوں بیان کی:

> "اس دفعہ جب نواب حصولِ پاکستان کے لیے اپنے کسی دورے پر سے واپس آئے اور اپنے باغ میں ٹہلتے ہوئے اس نے سمعیہ کو گھاس کی کھدائی کرتے دیکھ لیا تو اس نے قریب جا کر کہا ،بہت جوان ہوتی جا رہی ہے ری لونڈیا مگر جھاڑی میں چھپے اس کے باپ قادر خان کی کھانس پر اسے الٹے پاؤں لوٹنا پڑا۔"(۱۰)

اب ہندوستان سے ہجرت کرتے ہوئے فاصلے طے کرتے جو لوگ پاکستان میں عدل و انصاف دیکھنے واہگہ پار آئے تھے ان میں قادر خان بھی تھا اور اس کی بیٹی سمعیہ بھی۔ پُر مشقت زندگی نے پہلے ہی اسے بہت کچھ جھلسا دیا تھا۔ لیکن جس دن اس نے واہگہ پار کیا وہ اپنی ہڈیوں کا سارا گودا اپنی رگوں کا سارا خون سرحد پار چھوڑ آئی تھی جوان ہوتی چلی جانے والی لونڈیا اب ہڈیوں کی مالا تھی۔ دھوپ، بھوک، خوف اور سفر نے اس کی رگوں میں بڑھاپا اتار دیا تھا۔ باپ بیٹی اپنے لاکھوں بھائیوں کے ساتھ انقلاب کی تلخی اپنے جسم کے رونگٹے رونگٹے میں سمو کر لائے تھے اور انھوں نے جہنم کو قدموں قدموں چل کر طے کیا تھا۔ افسانے کا نقطہ انجام سوچنے پر مجبور کرتا ہے:

> "پاکستان میں داخل ہوتے ہی قادر خان سمجھا تھا کہ شاید جنت کا پھاٹک اس پر مکمل رہا تھا۔ لیکن اس کی یہ سمجھ کیمپ کی تیسری رات میں پوری واقفیت کے ساتھ نمودار ہو گئی جبرات بھر سردی برستی رہی اور انسان سکڑ کر دوہرے ہو ہو کر زندگی سے چمٹتے رہے۔ جب کیمپ کے کھلے میدان میں ایک پھٹی چادر سکڑی ہوئی سمیعہ اپنے جسم کی ساری حرارت سمیٹ کر سردی کا مقابلہ کر رہی تھی اور قادر خان سکڑ کر دوہرا ہو رہا تھا۔ رات بھر موت شکار کھیلتی رہی۔ نہ قادر خان رہا اور نہ سمیعہ۔"(۱۱)

افسانہ نگار دوسری طرف کا منظر طنزیہ انداز میں اس طرح پیش کرتا ہے کہ مرنے والے کب کسی نے گنے تھے۔ جو اس رات گنے جاتے۔ اخبار والوں نے ہدایات کے مطابق پوری احتیاط سے لکھا کہ اس رات صرف پانچ سو مہاجر سردی کا شکار ہوئے۔

تحریر
مجلہ زبان وادب
جلد ۰۲ شمارہ ۰۱، ۲۰۲۴

صبح کی چائے کے بعد جب اخبار نواب کے سامنے آیا تو انھیں شدید غصہ آیا بد معاش کہیں کے! کیڑے مکوڑوں کی طرح روز مر مر کر ہمیں بدنام کرتے ہیں۔

ہجرت کے واقعات پر افسانہ نگاری قیام پاکستان کے ابتدائی دس پندرہ سال تک رہی پھر موضوعات میں سیاسی، معاشی اور سماجی حالات و واقعات کے تذکرے ہونے لگے۔ سید اسعد گیلانی کے ہاں بھی ایسے کئی افسانے ملتے ہیں جو پاکستان کے ابتدائی حالات میں بد نظمی ، بے انتظامی اور لوٹ کھسوٹ کا عکس لیے ہوئے ہیں۔ ان افسانوں میں ”ڈاکوؤں کی بستی “، ”مجسمہ اور پرندہ“، ”کازارِ حیات “اور ”مکیں “نمایاں افسانے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی: ”اصناف ادب “سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۸ء، ص ۱۳۵

۲۔ پروفیسر فروغ احمد رائے: ”چاند کا سلام “ادارہ ادب اسلامی، سرگودھا، ۱۹۶۸ء، ص ۸

۳۔ پروفیسر فروغ احمد رائے: ”چاند کا سلام “، ص ۹

۴۔ سید اسعد گیلانی ”عدالت کا انتظار “اسلامی پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۶۲ء، ص ۱۳۰

۵۔ ایضاً، ص ۲۶۰

۶۔ سید وقار عظیم: (مضمون) ”داستان سے افسانے تک “مشمولہ ”نقوش “لاہور افسانہ نمبر، ص ۵۷

۷۔ سید اسعد گیلانی: الفیصل ناشران، تاجران کتب، لاہور، س ن، ص ۱۲۹

۸۔ ایضاً، ص ۱۳۶

۹۔ ایضاً، ص ۱۳۸

۱۰۔ ایضاً، ص ۱۴۰

۱۱۔ ایضاً، ص ۱۷۰